اردو رسم الخط

''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی''

ڈاکٹر سید تقی عابدی

اگر چہ اردو رسم الخط کا مسئلہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے کھڑا کیا گیا ہے لیکن گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں اس بحث میں جذباتیت کو بڑا دخل ہو چکا ہے جس کی وجہ سے مسئلہ سلجھنے کے بجائے الجھتا جا رہا ہے۔ آج سے تقریباً پینتیس سال قبل پروفیسر گوپی چند نارنگ نے دہلی کے رسالے ''جامعہ'' مطبوعہ مارچ ۱۹۷۲ء میں اپنے مضمون ''اردو رسم الخط'' میں صحیح کہا تھا کہ ''زبان کی طرح رسم الخط بھی عوامی چیز ہے اور ہر شخص کو اس پر اظہار خیال کا حق پہنچتا ہے۔ اس لیے اس مسئلے پر لکھنے والوں میں عالم اور عامی سبھی شامل ہیں۔ لیکن زیادہ تر تحریریں جذباتیت سے مغلوب ہو کر لکھی گئی ہیں جن کا مقصد اتنا روشنی پھیلانا نہیں جتنا گرمی بڑھانا ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو رسم الخط کے مسئلہ پر معروضی علمی انداز سے نظر ڈالی جائے اور تبدیلی کا مشورہ دینے والوں کے محرکات کا پتہ چلایا جائے نیز موجودہ رسم الخط کو زندہ رکھنے کے تہذیبی اور لسانیاتی پہلوؤں پر غور کیا جائے۔ پنڈت آنند نرائن ملاّ نے اپنے خطبہ صدارت جے پور اردو کانفرنس میں کہا تھا:

''تقسیم ہند کی وجہ سے اکثریت کے دلوں میں جو غبار آ گیا ہے وہ کسی طرح مٹنے کا نام نہیں لیتا اور پاکستان کے خلاف جو غصہ ہے وہ غریب اردو پر اتارا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کو اس ملک کی زبان ماننے سے انکار ہے۔''

اردو رسم الخط کے مسائل پر غور کرنے کے لیے اس کا لسانیاتی پہلو اور اس کا اردو زبان سے رشتہ دیکھنا پڑے گا۔ کسی بھی زبان کا رسم الخط اس زبان کی آوازوں کو علامتوں سے ظاہر کرتا ہے اس لیے وہ زبان کا تابع ہوتا ہے لیکن اغلب زبانوں میں وہ اس زبان کی شناخت بن جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کسی بھی رسم الخط میں دوسری زبانوں کی آوازوں کو بڑی حد تک پیش کیا جا سکتا ہے لیکن صرف ایک زبان کا رسم الخط اسی زبان کی صوتیات کو پوری طرح سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے چنانچہ اردو کا رسم الخط اردو کے لیے مختص ہے اور اسی لیے یہی اردو کا چہرہ یا اردو زبان کے جسم پر اس کی چھڑی کی طرح ہے جس کے تبدیل کرنے میں جسم کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ چونکہ اردو کا رسم الخط صدیوں کے تجربات اور استعمال کے بعد اس مقام پر پہنچا ہے کہ اس کی مانوسیت اور ہم آہنگی اردو زبان کی صوتیات سے گھل مل گئی ہے اسی لیے اب اس کی کھال نوچ کر اس پر دوسری کھال چڑھانا ممکن نہیں اس عمل سے اردو زبان کی شناخت اور انفرادیت ختم ہو سکتی ہے۔

بھارت میں بعض سیاست دان اور مغربی دنیا کے بعض اردو ہندی کے ادیب جو اردو کے رسم الخط کو دیوناگری یا رومن رسم الخط میں تبدیل کرنے کے خواہاں ہیں ان کی وجوہات زیادہ تر کم علمی، غلط فہمی، مفاد پرستی اور ذہنی تیرگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کے نظریات کے تحت

۱۔ اردو رسم الخط ایک غیر ملکی عربی/ فارسی رسم الخط ہے۔ یہ اسلامی رسم الخط ہے جس کا بھارت بھومی سے تعلق نہیں۔

۲۔ اردو میں مستعملہ فارسی عربی و ترکی کے الفاظ، اصطلاحات اور تلمیحات وغیرہ کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے نہیں بلکہ یہ سب عرب و عجم کی پیداوار ہیں۔

۳۔ اردو رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے سے بھارت میں قومی یکجہتی بڑھ سکتی ہے۔

۴۔ رسم الخط کی تبدیلی سے اردو کے لسانی ذخائر دیوناگری میں آسانی سے منتقل ہو سکتے ہیں۔

۵۔ چونکہ اردو ہندی ایک ہی زبان ہے بلکہ اردو ہندی کی ''شیلی'' ہے اس لیے دو رسم الخط کی ضرورت نہیں۔

۶۔ ترکی اور ازبکستان کے تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ زبان ترکی اور ازبک کا رسم الخط رومن اور روسی کرنے سے زبان ختم نہیں ہوئی بلکہ زبان کی ترقی ہوئی۔

۷۔ ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں اردو کو زندہ رکھنے کے لیے رسم الخط کی قربانی ضروری ہے۔

۸۔ اردو رسم الخط مشکل ہے اس میں کئی حروف ایک ہی آواز کے لیے ہیں جن سے رسم الخط کی تدریس اور تکنیکی ترقی میں رکاوٹ پیش آتی ہے اس لیے اس رسم الخط کو بدلنا چاہیے۔

۹۔ جدید ترسیلی ٹیکنالوجی جس میں انٹرنیٹ سائبر سسٹم وغیرہ ہیں اس میں اردو آسانی کے ساتھ رومن حروف میں لکھی جا سکتی ہے۔

اوپر بیان کیے گئے نظریات پر تفصیلی گفتگو درکار ہے لیکن ہم اس مضمون کی نوعیت سے اجمالاً چند نکات پر روشنی ڈالیں گے۔

یہ بھی زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ اردو کے رسم الخط کو عربی/ فارسی کا رسم الخط بتا کر اسے خصوصاً بھارت میں خارجی یا غیر ملکی رسم الخط بتایا جاتا ہے۔ یہاں کچھ نادان دوست جنھیں ہمیشہ ادبیات کو اسلامیات میں تبدیل کرنے کا جنون رہتا ہے اس رسم الخط کو قرآن مجید کے رسم الخط سے بھی تعبیر کرتے ہیں جس کا نتیجہ شدید ردعمل کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو کا رسم الخط سامی خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو عربی فارسی سے ہوتا اور صدیوں کے تجربات اور استعمال کی منازل سے گذر کر اب خاص اردو رسم الخط ہو گیا ہے کوئی عرب یا ایرانی نہ اس کو صحیح طریقہ سے پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی لکھ سکتا ہے مزید اس کو عربی یا ایرانی رسم الخط نہیں کہہ سکتا۔ اس میں موجود حروف تہجی اعراب اور علامتیں کچھ

سامی الاصل ہیں؛ اور کچھ خاص ہندوستانی جن کی آمیزش نے اسے خاص اردو پن دیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو زبان اور لسانیات میں اردو رسم الخط کی صوتیات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''اسے عربی فارسی رسم الخط کہنا غلط ہے اور ہمیں اس کو اردو رسم الخط کہنے پر اصرار کرنا چاہیے۔ جس طرح اردو ایک آزاد اور مستقل زبان ہے اسی طرح اردو رسم الخط بھی ایک آزاد اور مستقل رسم الخط ہے۔''

پروفیسر فتح محمد ملک اپنی مرتب کردہ کتاب ''اردو زبان اور رسم الخط'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔ ''اردو زبان کو ابتداء ہی میں عربی، فارسی رسم الخط کی نعمت میسر آ گئی۔ ساتھ ہی ساتھ برصغیر کے ہر خطے کی زبان میں بالکل قدرتی طور پر عربی/ فارسی الفاظ شامل ہوتے چلے گئے۔ صدیوں یہ لسانی عمل جاری رہا۔ تب جا کر کہیں اردو زبان اسلامی کلچر کی علامت بن کر ابھری۔۔۔۔ جب مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھین کر انگریز برصغیر پر قابض ہو بیٹھے تو ہندو احیائیت کے علمبرداروں نے انگریزوں کی سرپرستی میں ہنداسلامی کلچر کی اسلامی شناخت کو مٹانے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ اردو زبان کے عربی رسم الخط کے ساتھ ساتھ اردو میں شامل عربی فارسی الفاظ مسلمانوں کے خلاف منافرت کی اس مہم کا اولین نشانہ بنے۔ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے منشی للولال جی نے ۱۸۰۳ء میں ''پریم ساگر'' کی صورت میں اردو پر پہلا پتھر پھینکا۔''

جناب عزیز احمد ''اردو زبان کا فروغ اور تحفظ'' میں لکھتے ہیں۔ اردو کا رسم الخط اس کا اپنا منفرد رسم الخط ہے اور دنیا کے حسین ترین رسم الخطوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک طویل تاریخی عمل سے وجود میں آیا ہے۔ ہم اسے صدیوں سے اسی شکل میں برتتے اور قبول کرتے آئے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں۔ ہمارا رسم الخط ہمارے تلفظ ہماری شائستگی اور ہمارے لسانی، ادبی، علمی اور ثقافتی سرمائے کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ جس طرح اردو کا ماخذ اس کے اپنے علاقے کے عوام ہیں اسی طرح اردو کا رسم الخط بھی اپنے علاقے کی تاریخ کے بطن سے فطری انداز میں صورت پذیر ہوا ہے اور رفع وارتقاء کے عمل سے گذرا ہے۔

۱۹۶۰ء کے لگ بھگ جب اردو کے مشہور ادیب خواجہ احمد عباس نے ہندی کے رسالے ''دھرم یگ'' میں ایک مضمون شائع کیا جس میں اردو والوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا رسم الخط دیوناگری کر لیں تو اس کے جواب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون ''اردو رسم الخط۔ ایک تاریخی بحث'' کے عنوان میں لکھا۔ '' یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ جو لوگ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں وہ اردو اصوات تو کجا اردو اعراب سے پورے طور پر واقف نہیں ہوں گے۔ رسم الخط کی بات کرتے ہوئے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ ہندی اور اردو ایک زبان ہے۔ یہ بات جتنی صحیح ہے اتنی نہیں بھی ہے یعنی بنیاد کے اعتبار سے بے شک ہندی اور اردو دونوں زبانیں ایک ہیں لیکن اپنے ارتقاء کے دوران بوجوہ یہ زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔

واقعہ یہ ہے کہ دونوں زبانیں شورسینی پراکرت کی جانشین ہیں اور دہلی کے گردونواح کی کھڑی بولی پر قائم ہیں۔ اردو اور ہندی کو اب دو ملتی جلتی لیکن آزاد اور مستقل زبانیں سمجھنا چاہیے۔ بنیاد کو ایک تسلیم کرنے سے یہ قطعاً لازم نہیں آتا کہ دونوں کا رسم الخط ایک ہو۔ اگر یہ بات ضروری ہوتی تو آج اڑیا، بنگالی اور آسامی زبانوں کا رسم الخط ایک ہی ہوتا کیوں کہ یہ تینوں ماگدھی پراکرت کی جانشین ہیں لیکن اس کے باوصف ان کا رسم الخط ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہی ہندی اور اردو کا معاملہ ہے دونوں آریائی زبانیں ہیں لیکن اپنے ارتقائی سفر میں یہ دونوں زبانیں اتنی آگے بڑھ چکی ہیں کہ اب ان کے لیے ایک ہی رسم الخط کا تجویز کرنا دونوں کے حق میں صفر ہوگا۔

پروفیسر گیان چند جین کی متنازعہ کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب'' کے پیش لفظ میں پروفیسر محمد حسین لکھتے ہیں۔ ''سچائی یہ ہے کہ ہندوستان میں دو نہیں تین زبانیں مروج ہیں۔ ایک ہندوستانی ہے جو عام بول چال کی زبان ہے اور تقریباً ملک کے ہر حصے میں ہے دوسری ہندی اور تیسری اردو۔ ''پروفیسر واستو ماہر لسانیات نے جو اردو اور ہندی کے درمیان سات بنیادی اختلافات کی نشان دہی کی ہے یعنی رسم الخط، ش خ، ذ، ض، غ وغیرہ کے تلفظ، نشان اضافت، قافیہ وردیف، اصنافِ سخن رباعی غزل مرثیہ وغیرہ، تلمیحات وغیرہ مگر یہ بھی حتمی نہیں ہیں ان کے علاوہ بہت کچھ مشترک ہے۔

پروفیسر محمد حسین لکھتے ہیں۔ ''ایک بات واضح ہے کہ زبان کا لازمی رشتہ رسم الخط سے نہیں ہوتا۔ بد قسمتی سے ہندوستان میں یہی خوش فہمی عام ہے''۔ راقم پروفیسر صاحب کے جواب میں یہ ضرور کہے گا کہ زبان کا لازمی رشتہ رسم الخط کے ساتھ نہ سہی مگر زبان کا رسم الخط کے ساتھ رشتہ لازمی ہے اور پھر دنیا بھر میں اردو ہندی جیسی دو زبانیں نہیں جن کا رسم الخط ایک کر دینے سے دوسرے کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے۔

پروفیسر گیان چند جین نے اپنی اس متنازعہ کتاب میں بھی اپنے سابقہ مضامین کے خیالات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''دراصل اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں۔'' ''اردو ادب اور ہندی ادب دو آزاد ادب ہیں لیکن اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں ہیں۔'' دخیل الفاظ سے زبان کا تعین نہیں ہوتا۔ رسم الخط کا فرق بھی اسی طرح ایک زبان کے دو حصے نہیں کر سکتا۔''

اسی کتاب کے مقدمہ میں جناب کمال احمد صدیقی صاحب نے لکھا۔ ''جہاں تک گیان چند جین کے بنیادی نظریے کا سوال ہے کہ اردو ہندی ایک زبان ہیں مجھے اس سے اتفاق ہے۔'' یہاں اس بات کا ذکر بھی بیجا نہیں کہ پروفیسر گیان چند جین ارو ہندی کو ایک زبان مانتے ہوئے بھی اردو رسم الخط کی حفاظت پر زور دیتے ہیں۔'' مجھے اردو زبان اس کے اپنے رسم الخط اور اس کے ذخیرہ الفاظ کے ساتھ پسند ہے۔ میں اسے اردو خط کے علاوہ کسی اور لپی میں

برداشت نہیں کرسکتا۔ ہمارے جو اہل ہندی چاہتے ہیں اگر اردو دیوناگری لپی میں لکھی جائے اور اس کا شبد بھنڈار دیسی ہوتا جائے تو وہ اردو کہاں رہے گی۔ میں ہندوستان کے اردو والوں سے صرف اتنا کہوں گا کہ وہ اپنا رسم الخط بدلنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں۔ اگر انہوں نے اس سلسلے میں کوئی کمزوری دکھائی تو اردو ہندی کے اسالیب میں بہہ کر ختم ہو جائے گی۔ ہندوستان کے آئین میں اقلیتوں کی زبان اور رسم الخط کے تحفظ کو گارنٹی دی گئی ہے۔''

افسوس اس بات کا ہے کہ ہم اردو والوں نے اردو ہندی ایک زبان کہنے کا الزام صرف اہل ہندی پر رکھا جب کہ حقائق سے پتا چلتا ہے کہ اردو کے عظیم مشاہیر بھی اسی نالۂ شبگیر سے ہمنوا تھے۔

بھارت میں اردو رسم الخط کو دیوناگری سے اور مغرب میں رومن رسم الخط سے بدلنے کے حامیوں میں خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، راہی معصوم رضا، ڈاکٹر ملک راج آنند، ہاشم علی اختر کے علاوہ کئی اردو اور ہندی کے ادیبوں کے نام ملتے ہیں۔ یہ افراد بھی اردو کی بقاء کی ضمانت کے لیے اردو رسم الخط کی قربانی جائز سمجھتے تھے۔ اگرچہ ان افراد کی تعداد کم تھی اور اب بھی اس ذہنیت کے لوگوں کی تعداد محدود ہے لیکن ان کے نظریات کے مطابق بھارت اور مغربی دنیا میں اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے اور اردو بولنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے یعنی اردو اب کانوں کی زبان بن کر زندہ ہے اور یہ آنکھوں کی زبان نہیں رہی چنانچہ رسم الخط کو تبدیل کر کے اردو کو زندہ رکھا جائے۔

ان افراد سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ اردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر ہم کہیں ''مجھے پانی دو' تو یہ ہندی ہے، اردو ہے یا ہندوستانی اس کا فیصلہ کیسے ہو اور اگر ہم پانی کو دیوناگری میں لکھیں تو اسے کیسے اردو کہہ سکیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہمیں دیوناگری یا رومن رسم الخط میں اردو لکھنا اور پڑھنا سیکھنا ہے تو پھر اردو رسم الخط جو خود اردو کا عمدہ رسم الخط ہے اسے ہی کیوں نہ سیکھا اور سکھایا جائے۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ ہر زبان کا اپنا ادبی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہوتا ہے جو تحریری شکل میں محفوظ رہتا ہے اور اسی بنیاد پر اُس زبان کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے اگر ہم اپنا رسم الخط بدل دیں تو کیا یہ سارے ادبی خزانے بے معنی اور بے قیمت نہ ہوں گے۔ کیا ترکی زبان میں لکھی گئی صدیوں کی پرانی ترکی رسم الخط کی کتابیں جو کتب خانوں میں بے مصرف پڑی ہوئی ہیں ہمارے لیے لمحہ فکر اور مقام عبرت نہیں بن سکتی ہیں؟

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ہماری زبان کے مضمون ''اردو کا المیہ'' مطبوعہ جون ۱۹۷۱ء میں لکھا۔ چونکہ ہندی اور اردو ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں اس لیے اس میں ترجمے کا پردہ کم سے کم حائل رہتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور ''ادب اور نظریہ'' کے مضمون میں لکھتے ہیں۔ ''اردو کی بنیاد کھڑی بولی پر رکھی گئی ہے۔ اس اعتبار سے اس میں اور ہندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہندی اور اردو کا مستقل جداگانہ زبانیں نہیں ہیں۔''

پروفیسر احتشام حسین صاحب ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ ''حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کے نقطہ نظر سے اردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں۔ اگرچہ اردو اور ہندی لسانیاتی مفہوم میں دو زبانیں نہیں ہیں لیکن عملی حیثیت سے اس وقت تک انھیں دو الگ الگ زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے۔''

پروفیسر فتح محمد ملک اردو زبان اور رسم الخط میں لکھتے ہیں۔ ''لگ بھگ نصف صدی پیشتر امریکی سی آئی اے کی تائید و حمایت سے اقتدار میں آنے والے فوجی آمر فیلڈ مارشل ایوب خان نے جب اردو کو رومن رسم الخط اپنا کر ''ترقی'' کرنے کا فرمان جاری کیا تھا تب ہمارے سرکردہ ادیبوں اور دانشوروں نے یہ فرمان ماننے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔۔ آج ہمارے یہاں ایک مرتبہ پھر بڑی خاموشی اور کمال عیاری کے ساتھ ہمارا الیکٹرانک میڈیا اردو کو رومن رسم الخط میں پیش کرنے میں مصروف ہے ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اشتہارات میں رومن رسم الخط کے ذریعہ ہماری قومی زبان کا حلیہ بگاڑنے میں منہمک ہیں۔ کراچی کے ماہنامہ ''اردو'' نے اپنے مئی ۲۰۰۸ء کے شمارے میں خبر دی ہے کہ کراچی سے رومن رسم الخط میں اردو کے ایک روزنامہ کا اجراء عمل میں آ گیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس اخبار کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً رومن رسم الخط میں لکھے گئے اردو کتابچوں کا ہوتا چلا آیا ہے۔ رومن اردو کی ترویج کی یہ مساعی اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ ہماری اور ہماری قومی زبان کی منفرد تہذیبی اور لسانی شناخت کو مٹانے کے درپے قوتیں آج بھی سرگرم کار ہیں۔

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ جنہوں نے پروفیسر گیان چند جین کے جواب میں کتاب ''ایک زبان جو مسترد کی گئی'' لکھی اپنے مضمون ''ہندی امپیریلزم اور اردو'' میں لکھتے ہیں۔ ''یہ ہندی امپیریلزم ہی تو شمالی ہندوستان میں ۴۸ علاقائی بولیوں کو ہندی نے اپنے قلم رو میں شامل کر رکھا ہے جس سے ان بولیوں کی انفرادیت ختم ہو گئی ہے اور ہندی بولنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس امر کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندی بولنے والوں کا فیصد گھٹ کر ۲۷ رہ جاتا ہے۔ جین صاحب بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندی والوں نے امپیریلزم کے بل پر متعدد دوسری زبانوں اور بولیوں کو اپنی قلم رو میں ملا لیا۔ آئین ہند کے آٹھویں شیڈول میں مندرج ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں کے ساتھ اردو کا بھی اندراج ملتا ہے۔ جین صاحب اپنے ایک لسانی مضمون ''اردو ہندی یا ہندوستانی'' مطبوعہ ہندوستانی زبان اکتوبر ۱۹۷۳ء میں لکھتے ہیں ''ہندوستان کے آئین میں اردو ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے درج کرنا سیاسی مصلحت ہے لسانی حقیقت نہیں۔'' اردو اور ہندی نچلی سطح پر بلاشبہ ایک زبانیں ہیں۔ اس سے کسی ماہر

لسانیات کوانکار نہ ہوگا لیکن ادبی علمی تہذیبی اور فنکشنل سطحوں پر بلاشبہ یہ دو مختلف زبانیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اردو اور ہندی کو ایک زبانیں قرار نہیں دیا جا سکتا۔

پروفیسر بیگ مزید لکھتے ہیں اردو بھی جو ایک خودمختار ترقی یافتہ اور معیاری زبان ہے ہندی امپیریلیزم سے نہ بچ سکی۔اہل ہندی نے اردو کی ادبی اور لسانی تاریخ سے مبینہ طور پر چشم پوشی کرتے ہوئے محض اپنی تنگ نظری اور لسانی تعصب کی بنا پر اور ہندی کی برادری کو وسیع تر کرنے کی غرض سے اس زبان کو ہندی کی ایک ''شیلی'' قرار دے دیا۔''شیلی'' کا مطلب ہوتا ہے کسی زبان کا محض ایک اُسلوب یا اسٹائل۔کسی آزاد مستقل اور ترقی یافتہ زبان کو کسی دوسری زبان کی شیلی کہنا اس کے وجود کی نفی کرنا ہے اس کی لسانی انفرادیت کو ختم کر دینا ہے۔اور اس کے تمام تر ادبی اور لسانی سرمایے پر شب خون مارنا ہے۔اہل ہندی نے اردو کو ہندی کی شیلی قرار دے کر یہی سب کچھ کیا ہے۔اردو کو ہندی کی شیلی کہنے کی بدعت انیسویں صدی کے نصف دوم میں شروع ہوئی جب کھڑی بولی ہندی کے ایک حمایتی ایودھیا پرساد کھتری نے کھڑی بولی ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہ مانتے ہوئے اردو کو ہندی کی ''شیلی'' قرار دے دیا۔کھتری کہتے تھے کہ اردو اور ہندی میں فرق صرف ''لپی'' رسم الخط کا ہے۔کھتری اہل اردو کو یہ مشورہ بھی دیتے تھے کہ وہ فارسی رسم الخط کو چھوڑ کر دیوناگری رسم الخط اختیار کر لیں۔ اُدھر مسلم لیگ نے اسے خطرے کی گھنٹی جان کر ۱۹۱۷ء کے کلکتہ کے اجلاس اور ۱۹۱۹ء کے امرتسر کے اجلاس میں اردو زبان اور فارسی حروف تہجی کے تحفظ کی ضرورت پر زور دیا جس کا نتیجہ ۱۹۳۶ء کی قرارداد میں دفعہ (۱۱) اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت قرار دیا۔

ڈاکٹر اطہر فاروقی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔اگر اردو کی گیان چند جین کے لیے واقعی کوئی قدر تھی تو کیا انہوں نے اپنے بچوں کو اردو پڑھائی۔ راقم نے کئی بار شہر لاس انجلس میں گیان چند جین کے بیٹے اور بہو اور خاندان کے افراد سے ملاقات کی وہ سب سلیس اور شگفتہ اردو میں بات کرتے ہیں مجھے یہ علم نہیں کہ وہ اردو پڑھ اور لکھ بھی سکتے ہیں۔ڈاکٹر اطہر فاروقی کا سوال محکم ہے لیکن اس سوال کو صرف گیان چند کی فیملی تک محدود رکھنا صحیح نہیں۔برصغیر میں بھارت اور پاکستان کے زیادہ تر افراد جو اپنے کو اردو کا مسیحا کہتے اور کہلواتے ہیں ان کے گھروں میں بھی اب اردو صرف کانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے اکثر خاندان کے جوان اردو رسم الخط سے بے بہرہ ہیں۔اردو رسم الخط ایک زندہ اور توانا رسم الخط ہے جو نہ صرف اردو زبان و ادب کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھنے کی ضمانت کرتا ہے بلکہ دوسری بولیوں کو زندہ رکھنے اور ان کو ادب کے زمرے میں ترقی دینے کے لیے مددگار ثابت ہوا ہے۔ڈاکٹر محمد صغیر خان کے مطابق قدیم زبان پہاڑی جس کا تعلق بھی ہند آریائی خاندان کی زبانوں سے ہے جو آج بھی کروڑوں لوگوں کی زبان ہے اور جسے ماہرین لسانیات نے مشرقی پہاڑی یا نیپالی ، وسطی پہاڑی اور مغربی پہاڑی یا لنڈا کہا ہے اور جو ریاست جموں کشمیر کے علاقوں، نیپال اور ڈیرہ دون، شملہ وغیرہ میں رائج ہے اور جس کے لیے ماضی بعید میں اور بعض مقامات پر آج بھی ''لنڈا'' شاردا یا ٹاکری رسم الخط استعمال ہوتا رہا ہے تو اب اسے زندہ اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت دینے کے لیے شاہ مکھی یا نستعلیق رسم الخط ہی استعمال ہو رہا ہے چنانچہ جب اردو رسم الخط میں اتنی گنجائش ہے کہ دوسری قدیم بولیوں کو بھی اس میں لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے تو پھر کیسے اردو کا سر اُس کے کاندھوں پر بار ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ آج سے تقریباً سو سال قبل اردو ترقی بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور آج اردو تحفظ بورڈ کی ضرورت لاحق ہے اردو زبان صرف بول چال یا کانوں کی زبان بنتی جا رہی ہے ایسے موقع پر اردو رسم الخط کے مسائل اردو لکھنا پڑھنا اور اردو کی بنیادی تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔آج سے چند برس پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ رسم الخط کا مسئلہ پاکستان کا ادبی سماجی، لسانی، سیاسی اور مذہبی مسئلہ اس لیے بھی نہیں ہے کہ وہاں مقامی زبانوں اور بولیوں کو بھی اردو رسم الخط میں لکھا جاتا ہے لیکن یہ بات بھی ذہن نشین کرنی چاہیے کہ دنیا کے کسی حصے میں بھی جو مسئلہ اردو کی بقاء کے لیے اٹھتا ہے وہ خود بخود پاکستان کے ادیبوں دانشوروں اور اردو پرستاروں کا مسئلہ بن جاتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ پریسیڈنٹ ایوب خان کے زمانے سے آج تک رومن رسم الخط کی تبلیغ اور تشہیر شدت سے جاری ہے جس کا نتیجہ آج خود پاکستان کے معاشرے اور سائبر انٹرنیٹ سسٹم پر دیکھا جا سکتا ہے جس کا ذکر پروفیسر فتح محمد ملک نے بھی اپنی مرتبہ کتاب میں کیا ہے۔اردو پرستاروں کو چاہیے کہ جذباتیت کے بدلے محنت اور سچی لگن سے اس مسئلہ کو حل کریں۔اگر اردو والے اردو کے رسم الخط کو اپنے بچوں کو سکھاتے رہیں تو دنیا کی کوئی قوت ان سے رسم الخط کو چھین نہیں سکتی۔یہ سچ ہے کہ حکومت کی سرپرستی اور ہمدردی زبان کے فروغ میں مدد دیتی ہے لیکن یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب اردو والے خود اردو کے ساتھ اس کی بنیادی تعلیم، اس کو روٹی اور روزگار سے جوڑنے اور اس کے رسم الخط وغیرہ کو جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے عام کرنے میں پیش پیش رہیں۔

اردو رسم الخط اردو کی آن بان اور شان ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کی پہچان بھی ہے۔اس کا رشتہ اردو ادب سے جسم اور جلد کا رشتہ ہے اس میں صدیوں کی ادبی، علمی، تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی اقدار کی نمائش ہے اس کی مدد سے ہم میڈل ایسٹ اور ایشیاء کے کئی ملکوں سے لسانی رشتے قائم کر سکتے ہیں، یہ دوسری زبانوں کی نسبت مختصر نویسی کا عمدہ نمونہ ہے۔یہ غیر ملکی یا کسی خاص مذہب کی میراث نہیں بلکہ ایک مستقل زبان جو برصغیر کے بطن سے پیدا ہوئی اور اسی سر زمین پر پلی بڑی ہوئی اور آج اسی کا سرمایہ ایک گھنے درخت کے مانند ہند و پاک سرحد کے دونوں جانب ہے اور اس کی ٹھنڈی ہوائیں دنیا کے گوشے گوشے میں

نسیم سحر کی طرح دلوں کو شاد کرتی ہیں۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے اپنی کتاب ''اردو زبان اور اس کا رسم الخط'' کے دوسرے حصے میں رسم الخط پر عمدہ گفتگو کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ دیوناگری اور رومن رسم الخط میں اردو سے زیادہ دشواریاں اور نقائص ہیں۔اردو کا رسم الخط بدلنے سے جو مضر اثرات اور منفی نتائج ہونگے اس کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

۱۔رسم الخط بدلنے سے زبان کی ہیت بدل جاتی ہے

۲۔عربی اور فارسی سے رابطہ خود زبان کی نشو ونما کے لیے ہے ختم ہو جائے گا۔

۳۔زبان کا حال اور ماضی سے رشتہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے لفظوں کی پہچان باقی نہ رہے گی۔

۴۔ہزار ہا کتابیں جو اس رسم الخط میں چھپ چکی ہیں ضائع ہو جائیں گی۔

۵۔حرفوں کی تبدیلی سے حساب جمل کا وجود نہ رہے گا۔

۶۔شاعروں اور ادیبوں نے جو لفظی صنعتوں میں کمال دکھایا ہے وہ نظر نہ آسکے گا۔

چنانچہ اردو کا موجودہ رسم الخط اسی طرح سے برقرار رہنا چاہیے۔

ڈاکٹر رؤف پارکھ رومن اردو۔نو Roman urdu? No میں لکھتے ہیں:

Script is to language what spirit is to body. Without its own, innate script, a language is merely a dead body a spiritless mass of assembled limbs. Is that what we want urdu to become by discarding the arabic script and taking on the roman one.

ہم اس گفتگو کے آخر میں صرف یہی کہیں گے اگر اردو والے رسم الخط کی حفاظت اور اس کے استعمال کی عادت کر لیں اور اس گراں قدر امانت کو اپنی نئی نسل کو منتقل کریں تو دنیا کی کوئی طاقت ان سے ان کی زبان کا رسم الخط چھین نہیں سکتی۔ہمیں دوسروں پر الزام دھرنے سے قبل اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے کہ اس جرم میں حقیقی مجرم کون ہے۔ہم نے اس گفتگو میں سطروں سے زیادہ بین السطور باتیں کہی ہیں اور بہت سی باتیں بقول آزاد انصاری:

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اور اسی لیے

میں میکدہ کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

۔بقیہ پیہم موج امکانی۔

بھی ''ابواب المصائب'' کا قدرے تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

دبیریات ہی کے سلسلے کی ایک اور اہم کتاب ''رباعیات دبیر'' ہے جس پر تقی عابدی ان دنوں کام کر رہے ہیں۔یہ کتاب مرزا دبیر کی ۱۲۰۰ سے زائد رباعیات پر مشتمل ہے جن کے یکجا ہونے اور کتابی صورت میں منظر عام پر آنے کے بعد بلاشبہ مرزا دبیر کو ایک اہم ترین رباعی گو شاعر کی حیثیت سے بھی دیکھا جا سکے گا۔سید تقی عابدی کی ان کتابوں کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں مرزا دبیر کو ایک بڑے مرثیہ گو شاعر کے علاوہ ایک اہم مثنوی نگار ایک اہم نثر نگار اور ایک اہم رباعی گو شاعر کی حیثیت سے بھی وہ مرتبہ حاصل ہونے کی توقع ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

''پیہم موج مکانی میں، اگلا پانو نئے پانی میں'' کے بمصداق سید تقی عابدی کی مرتبہ تازہ ترین کتاب ''کائنات نجم'' ہے جس میں انہوں نے بڑی محنت، لگن اور خلوص کے ساتھ نجم آفندی کے تقریباً تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے علاوہ ان کا زندگی نامہ، ان کی غزلوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، ان کی نعت گوئی، منقبت نگاری اور نجم کے سلاموں کی آفاقی قدریں' جیسے موضوعات پر اپنے تفصیلی مضامین کے ساتھ ساتھ نجم آفندی کی حیات، شخصیت اور فن شاعری پر لکھے ہوئے دیگر قلمکاروں کے مضامین بھی شامل کیے ہیں۔

''کائنات نجم'' میں نجم آفندی کے تین مرثیے (فتح مبین، معراج فکر اور ایک غیر مطبوعہ مرثیہ) شامل ہیں۔ان میں سب سے طویل مرثیہ ''معراج فکر'' ہے جو رضا کار بکڈپو، لاہور اور پھر سرفراز پریس سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا تھا اس کا مقدمہ ممتاز ترقی پسند ناقد سید احتشام حسین نے لکھا ہے۔'' کائنات نجم'' میں نجم آفندی کے نثری رشحات قلم بھی شامل ہیں۔ان میں نفس اللہ، حسین اور ہندوستان کا سمبندھ اور لغات المذہب خاصے کی چیزیں سہی تاہم محمد احسن فاروقی کے اس قول سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے کہ نثر میں جو کچھ بھی وہ چھوڑ گئے ہیں وہ آگے آنے والوں کیلئے مشعل راہ ہے۔

سید تقی عابدی نے اس کتاب میں شامل اپنے ایک مضمون میں نجم آفندی کی شاعری سے کئی مثالیں پیش کر کے انہیں سرمایہ داری جبر کے خلاف احتجاج کی پہلی آواز قرار دیا ہے۔ان کی تحقیق کے مطابق نجم آفندی نے اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز سے قبل کسانوں مزدوروں اور سماج کے دبے کچلے افراد کے بنیادی مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کیا تھا لیکن ترقی پسند ناقدین انہیں مسلسل نظر انداز کرتے رہے ہیں۔

امید ہے کہ سید تقی عابدی کی یہ کتاب نجم آفندی کے تعین قدر میں اہم کردار ادا کرے گی اور انہیں نہ صرف عزائی ادب میں بلکہ بیسویں صدی کے اہم رباعی گو اور قطعات نگار شعراء کی صف میں بھی ان کا صحیح مقام و منصب دلانے میں معاون ثابت ہوگی۔